علمی ترقی کے ذرائع اور مراحل

تصوّرِ علم کے عنوان سے بعض الفاظ و اصطلاحات کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ یہ بظاہر محض اشارے تھے، لیکن جب ان پر غور کیا گیا تو پتہ چلا کہ جب سے حقائق کی تلاش جاری ہے اور انسان علم سے متعلق غور کرنے میں مصروف ہے، یونان کے فلسفیوں سے لے کر عصر حاضر کے دانش وروں تک تمام ارباب فکر کی تصنیفات و تالیفات یک جا کر لی جائیں تو سب کا بنیادی نقطہ انہی چند چیزوں کے گرد گھومتا ہے کہ دراصل انسان علم اس لیے حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو منظّم کر سکے، اسے ترتیب دے سکے اور اس میں موجود خرابیوں، کمزوریوں، کجیوں اور کوتاہیوں اور نقائص کا ازالہ کر سکے اور اپنی زندگی میں حسن بھر سکے۔ فیثا غورث، سقراط، افلاطون اور ارسطو نے اور جدید دنیا کے مفکرین اور ان کے درمیانی عہد میں جس قدر فلاسفہ اور مفکرین اس دنیا میں آئے ہیں۔ سب کی سوچ کا نتیجہ یہی نکلا ہے کہ زندگی کے حسن کو یقینی بنانے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ایک اور قدم آگے بڑھائیں گے کہ جب علم انسان کی زندگی کی تزئین و آرائش اور نظم وضبط پر مبنی بہتری لاتا ہے اور ہم اس پر یقین رکھتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم یہ جان پائیں کہ ان سب خوبیوں کے حصول کے لیے علم کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وہ خالق فطرت کہ جس نے انسان اور فطرت دونوں کو تخلیق کیا ہے اس نے تعلیم و تربیت اور علم کو آگے بڑھانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہی درحقیقت سب سے بہتر اور سب سے اچھا ہے۔ اشیاء اسی زندگی میں ہمارے آس پاس موجود ہوتی ہیں اور ہم انہیں استعمال بھی کر رہے ہوتے ہیں اسی میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر ان کے بارے میں حقیقی ادراک ہمیں کبھی کبھی حاصل ہوتا ہے۔ اگر کسی کو یہ خصوصی ادراک نہ بھی میسر آئے تو بھی وہ دستیاب وسائل کی مدد سے اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی بھرپور کوشش میں مسلسل مصروفِ عمل نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم ان وسائل پر غور کریں گے تو بظاہر بات آسان سی لگتی ہے کہ ان کے ذریعے زندگی کو باسہولت اور معنی خیز بنایا جا سکتا ہے، مگر حقیقت میں ان معاملات کو سمجھنا اس قدر آسان بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جب یہی آسان بات علم کی دنیا میں پہنچتی ہے تو اس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ یہ امر انسانی فطرت میں سمو دیا گیا ہے کہ جب بھی انسان کسی حوالے اور ذریعے سے علم حاصل کرتا ہے تو اس کے حواس اس میں براہِ راست اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ بظاہر حیوانی حواس انسانی حواس کے مقابلے میں فروتر محسوس ہوتے ہیں تاہم دنیا میں ایسے کئی جانور اور چرند پرند موجود ہیں جو اپنی حسی قوتوں کے اعتبار سے انسان کی ابتدائی حسی صلاحیتوں کے مقابلے میں بہت قوی تر نظر آتے ہیں مثلاً اگر انسان وہی ابتدائی حسی قوتیں استعمال کرے جو ابتدائی مرحلے پر اس کی دسترس میں ہوتی ہیں اور ان کی تقویت کے لیے کوئی اضافی

ذریعہ استعمال نہ کرے تو وہ فطری حقائق جاننے اور مشاہدہ فطرت میں حیوانوں سے پیچھے رہ جائے۔ ایسے بہت سے جانور ہیں جو تاریکی میں دیکھ سکتے ہیں مگر انسان کو تاریکی میں دیکھنے کے لیے انفراریڈ شعاؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے، ایسے بہت سے پرندے ہیں جو میلوں کے فاصلے سے طوفانوں کا رُخ دیکھ کر اپنے ارادے اور مقامات بدل لیتے ہیں اور درختوں سے اپنے آشیانے اٹھا لیتے ہیں۔ ایسے حشرات الارض مشاہدے میں آ چکے ہیں جو بارش آنے سے کافی دیر پہلے محفوظ مقامات پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً چیونٹیاں اپنے انڈوں کو محفوظ جگہوں پر منتقل کر دیتی ہیں۔ چند سال پیشتر اسی سرزمین اسلام آباد میں جب زلزلہ آیا تھا تو بے شمار مثالیں لوگوں نے مشاہدہ کیں کہ زلزلے سے کچھ ہی دیر پہلے پرندے غائب ہو گئے تھے (جیسے دور دراز خطوں میں ہجرت کر گئے ہوں) اور پالتو جانوروں نے رسیاں تڑانا شروع کر دیں۔

اسی لیے جب انسان ابتدائی زمانے میں دیکھتا ہے تو بظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ حیوانات انسانوں پر حسی قوتوں کے اعتبار سے برتری کے حامل ہیں۔ چنانچہ انسان کی زندگی اس وقت تک مزین ہو ہی نہیں سکتی جب تک وہ اس دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ حسی قوتوں کا بھرپور اور زیادہ سے زیادہ استعمال نہ کرے۔ اگر آپ اس نکتے پر ذرا دیر کے لیے توجہ مرکوز کر سکیں تو دانشوروں کی تحقیقات آپ پر یہ حقائق واضح کرتی ہیں کہ اگرچہ انسان کے پاس حصول علم کے لیے متعدد حسیات موجود ہیں (ظاہر حسیات بھی پانچ ہیں جیسے دیکھنا، سننا، چھونا، سونگھنا اور چکھنا وغیرہ) مگر ان میں سے جو حس اس عمل میں سب سے زیادہ شدت اور کثرت سے استعمال ہوتی ہے وہ حسِ بصارت ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق انسان کے دائرہ فہم میں آنے والی معلومات کا کچھ ذریعہ اس کا دیکھنا یعنی اس کی نگاہ اور حسِ بصارت ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

معلومات کا پچھتر فیصد (75%) بصارت سے حاصل ہوتا ہے، پندرہ فیصد (15%) معلومات انسان کو حسِ سماعت کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں جبکہ چار فیصد (4%) معلومات کا ذریعہ اس کی قوتِ لامسہ ہے۔ تین فیصد (3%) علم اسے قوتِ ذائقہ یعنی چکھنے کی حس سے دستیاب ہوتی ہیں جبکہ تین فیصد (3%) معلومات کا ذریعہ اس کی قوت شامہ یعنی سونگھنے کی قوت ہے۔ اگر آپ ان اعداد و شمار کو ذہن میں رکھتے ہوئے صورت حالات پر غور فرمائیں تو بصارت کی قوت کے دائرہ کار کے متعلق عجیب حقائق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بصارت سے محروم ہے مگر اس کا ذہن معلومات سے خالی نہیں۔ کئی بیناؤں کے مقابلے میں وہ نابینا، علم کے مقابلے میں زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ معروف مسلم مفکر اور مصنف طٰہٰ حسین نابینا تھے۔ مگر انہوں نے مصر میں اپنی ابتدائی تعلیم غیر معمولی کامیابی کے ساتھ مکمل کر کے فرانس کا قصد کیا جہاں انہوں نے اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔ اور جب واپس اپنے وطن آ گئے تو ان کی حکومت نے انہیں وزارتِ تعلیم کا قلمدان سونپا مگر اسی دوران حکومت فرانس نے حکومتِ مصر سے درخواست کی کہ ان کی خدمات فرانس کو دے دی جائیں تاکہ وہ ان کی مدد سے اپنی مملکت میں علم کی ترقی کے عمل کو آگے بڑھا سکیں۔ مگر حکومتِ مصر کی طرف سے فرانس کو یہ جواب بھیجا گیا، کہ ''مصر کے بیناؤں کو اس نابینا سے راہنمائی لینے کی سخت ضرورت ہے''۔

اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگرچہ یہ شخص ظاہر کی بینائی یعنی بصارت سے محروم ہے مگر قدرت نے اسے بصیرت کی وہ بے پناہ

صلاحیت عطا کر رکھی ہے کہ بے شمار صاحب بصارت افراد اس کی گرد کو نہیں پا سکتے اور دنیا میں ایسے قابل قدر اور نابغۂ روزگار افراد کی کمی نہیں ہے۔

اس مثال سے کائنات کے نظامِ حیات سے متعلق ہمیں یہ راہنما اصول ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ظاہری حس سے محروم ہوتا ہے تو خالقِ کائنات اس کی کسی دوسری حس کو اس قدر قوی کر دیتا ہے کہ پہلی حس کی کمی دُور ہو جاتی ہے اور اس کی مدد سے زندگی میں پائی جانے والی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے پاس مطلوبہ عزم اور حوصلہ موجود ہو۔ آج کی دنیا میں کون نہیں جانتا کہ جس کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، اس کی انگلیاں دیکھنا شروع کر دیتی ہیں (نابیناؤں کے پڑھنے کے لیے بریل سسٹم کی مثال قابل غور ہے) اس کا مظاہرہ ہمارے سامنے آئے دن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حسیات کا علم اور اس کا مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دو حسیات کا ذکر بالخصوص اپنی کتاب ہدایت میں بار بار کیا ہے۔ جنہیں انسان سب سے زیادہ استعمال کرتا ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ والأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (سورۃ النّحل ۷۸) اور اس نے تمہارے لئے سماعت، بصارت اور دل بنایا تا کہ تم شکر کر سکو۔ انسان صدیوں کی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان حسیات میں سے دو کا اس کی زندگی اور حصول علم کے عمل میں بڑا کردار ہے مگر اللہ رب العزت نے آدم کی تخلیق کی ابتدا پر ہی یہ کہہ دیا کہ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ قليلاًمَّاتَشْكُرُونَ۔ (السجدۃ ۹) ۔''اور اس (اللہ) نے اسے (آدم) اعضا کے اعتبار سے پورا تناسب اور توازن عطا کر دیا اور پھر اس میں اپنی روح کا ایک جزو ڈال دیا اور اس نے تمہارے لیے سمع و بصر اور دل بنائے لیکن تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو''۔ یہ جملہ خود تحقیق و جستجو کا ایک بہت بڑا میدان کھول دیتا ہے کیونکہ جب بھی انسان اپنی تخلیق کے عمل کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا ہے تو یہ جملہ اس کا سر فخر سے بلند کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ کہا ''ہم نے اپنی روح کا ایک حصہ اس میں ڈال دیا ہے''۔ اسی لیے انسان کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے بعض اسرار اور اثرات موجود ہیں۔ اللہ ربّ العزت نے جہاں سماعت و بصارت کا ذکر کیا ہے اسی آیت میں دل عطا کرنے کی بات ہے۔ دل ایک الگ اور مکمل موضوع اور پوری نشست کا تقاضہ کرتا ہے۔ اسی دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سماعتوں اور بصارتوں کے علاوہ کئی دوسری صلاحیتوں کو بھی جوڑا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں یہ واضح اشارہ بھی موجودہ ہے کہ بہت سے انسان اللہ کی عطا کردہ بصارت اور سماعت کی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہیں مگر وہ شکر گزاری کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے پایا ہے وہ تو خود ان کی صلاحیتوں اور محنت کا ثمر ہے۔ اس طرح گویا وہ خالق کائنات کے احسانات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے جس میں براہ راست ان ذرائع کا ذکر ہے جو سیکھنے سکھانے میں مدد دیتے ہیں۔ خالقِ عالم نے فرمایا ہے اَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَينَين (کیا ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟) وَلِسَاناً وَّشَفَتَين (اور کیا اسے زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کیے)۔ اس نکتے کے لیے بڑی تفسیر اور تفصیل درکار ہے لیکن ایک اشارہ کیے دیتا ہوں کہ دنیائے علم میں حرف و آواز کے اعتبار سے زبان اور ہونٹ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب اللہ نے ایک خاص لہجے میں یعنی تعجب کا لہجہ لیے ہوئے کہا کہ ''کیا آنکھیں عطا نہیں کیں؟'' تو یہ جان کر انسان تعجب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ بہت سے انسان دنیا میں صاحب بصارت تو ہیں مگر وہ اپنی بصارت کو صحیح انداز میں صحیح مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے حس بصارت سے بس اتنا کام

لیا ہے جتنا عام طور پر حیوانات لیتے ہیں (وہ اس میں کوئی اضافہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان کی نظر ایک حد سے آگے کا نہیں دیکھتی۔) اسی لیے ان کی نظر کو اللہ تعالیٰ نے نظر کہا ہی نہیں جو محض زندگی کی چند ابتدائی ضروریات کی تلاش میں صرف ہو جائے۔ یہ کام تو حیوانات کا ہے جو پوری زندگی چند ضروری احتیاجات کو مطمئن کرنے کے لیے گزار دیتے ہیں۔ جبکہ نظر کا سزاوار انسان ہے جس نے فکر و نظر کے ذریعے کائنات کے رازوں اور انواع و اقسام کی توانائیوں کو تلاش کرنا ہے۔ اسی لیے مذکورہ آیت میں ایسے سوالیہ انداز میں کہ جس میں نفی و حسرت کی کیفیت بھی ہے کہا گیا ہے اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ۔ کیا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں (تو پھر یہ ان سے دیکھتا کیوں نہیں؟) وَلِسَاناً وَّ شَفَتَيْنِ کیا ہم نے اسے زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے (وہ ان کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتا) اور دو ہونٹوں کا تذکرہ خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ زبان کے وظیفے کی ادائیگی میں ہونٹ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو انسان زبان کی صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گا کیونکہ ان کے بغیر زبان اپنے صوتی اشاروں کو الفاظ کا روپ دینے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ اسی لیے دو ہونٹوں کا تذکرہ کیا ہے اس کا تعلق زبان کی قوتِ گویائی کے ساتھ ہے اور دیکھیے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت بڑی دعا سکھائی ہے اور جب بھی کوئی شخص کوئی بات کرنا چاہے یا کسی بھی مجلس میں جانے کا خواستگار ہو، کسی فرد کے سامنے اپنے دل کی بات یا کسی ضرورت کا ذکر کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِي وَ يَسِّرْلِي اَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِّسَانِي [طٰهٰ: ۲۵-۲۷]

(اے میرے رب میرے سینے کو کھول دے اور میرے کام کو (جس کا بیڑا اٹھا رہا ہوں) آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے)

یہ دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سکھائی گئی جب وہ فرعون کے جاہ و جلال والے دربار میں کلمۂ حق ادا کرنے جا رہے تھے اس وقت انہیں جس فصاحت و بلاغت کی ضرورت تھی اسے اللہ تعالیٰ سے طلب فرما رہے تھے۔ اس اعتبار سے جب حسّیات اور ان کے ذریعے حصولِ علم کا تذکرہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علم کے ابتدائی مدارج میں ہمیں اپنی ظاہری حسّیات یعنی سماعت، بصارت، لمس، قوتِ شامہ اور ذائقہ کے استعمال سے ہی ضرورتیں پوری کرنے میں کامیابی ہو جاتی ہے۔ اس لیے سماعت و بصارت کے حقیقی استعمال یعنی مشاہدۂ کائنات پر توجہ مبذول اور مرکوز کرنے پر بھی زور دینا چاہیے۔ انسان کی زندگی کا آغاز ان ہی مراحل سے ہوتا ہے کہ سب سے پہلے انسان باہر کی آوازوں کو سنتا ہے تو ماحول کی طرف متوجہ ہو کر مظاہرِ فطرت کو دیکھتا اور اس کا مشاہدہ کرتا ہے اور یوں اپنی صلاحیتوں کو آگے بڑھاتا ہے اپنے قویٰ میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ زندگی کے عین ابتدائی دنوں ہی سے علم کا یہ دروازہ یعنی سماعت اور مشاہدے کا در کھل جاتا ہے اور ان کے راستے سے حصولِ علم کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو سماعت سے حصولِ علم کی بات کا اطلاق بڑی عمر کے افراد پر ہی نہیں ہوتا بلکہ چھوٹے بچوں کی صلاحیت سماعت بھی ان کے لیے حصولِ علم کے دروازے کھولتی ہے۔ البتہ یہ نکتہ اہم ہے کہ اس کا اطلاق یقین اور اعتبار کی بنیادوں پر استوار ہونے کے بعد کی صورتِ حال پر ہوتا ہے۔ یعنی جب ہم کسی ایسے فرد کی بات سنیں جس کی صداقت پر ہمیں یقین ہے ہم بغیر تحقیق کے بھی اس کے کہے کو اپنے مبلغِ علم میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس طرح گویا یہ علم کا دوسرا بنیادی ذریعہ ہے۔

چھوٹے بچے مختلف معلومات کے حصول کے لیے اپنے والدین کو ناقابلِ تنسیخ اتھارٹی سمجھتے ہیں۔ بہت چھوٹا بچہ تو اپنے والد کو دنیا کا عقل مند ترین اور طاقت ور ترین فرد اور اپنی ماں کو دنیا کا قوی ترین ملجا و ماویٰ قرار دیتا ہے۔ اس کو سب سے بڑا ذریعہ

محبت وتحفظ قرار دیتا ہے۔اس لیے ان ابتدائی دنوں میں والدین خصوصاً ماں کی طرف سے بچے کو معلومات کا جو ذخیرہ ملتا ہے وہ بلاکم وکاست اس کی علمی ذات کا مستقل حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ایسی باتوں پر اس کا یقین دنیا بھر کی باتوں سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص سے اس کے والد کا نام پوچھا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسے معلوم ہے بلکہ اسے یقین بھی ہے بلکہ یہ یقین ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔اگر کوئی اس نکتۂ علم کے حوالے سے اس کے ذہن میں کوئی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرے گا تو متعلقہ فرد اس سے لڑ پڑے گا کہ اس کے والد کے بارے میں اس کی طرف سے پیش کی گئی معلومات میں غلط فہمی کا شائبہ پیدا کرنے کی اسے جرأت کیسے ہوئی۔کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ جس ہستی کی طرف سے اسے یہ معلومات ملی ہیں اس کے لیے وہ کائنات کی سچی ترین ہستی ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جانوروں سے ممتاز کرنے کے لیے اسے حصولِ علم کے جو دیگر ذرائع اور وسائل عطا کیے ہیں وہ قابل اعتبار ہستیوں کی صورت میں ہیں۔اور اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی انسان کو ان قابل اعتبار ہستیوں کی سرپرستی میسر آ جاتی ہے۔آدم علیہ السلام کے ساتھ اس کا تعلق یوں ہوا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو انہیں مراحل بچپن سے نہیں گزرنا پڑا بلکہ انہیں اپنی پوری مکمل زندگی کا وجود، وقار اور اعتبار مل گیا۔اسی لیے ان کے علم کا آغاز خود علیم اور خبیر سے ہوا اور حضرتِ آدم علیہ السلام نے اللہ کی طرف سے سکھائے ہوئے نام بتائے اور فرشتوں پر فوقیت حاصل کر لی تو گویا یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ابتدائی زندگی میں ہی جب انسان، اشیاء، افراد اور مقامات کے نام جاننا اور اُنہیں شناخت کرنا شروع کرتا ہے تو گویا حصولِ علم کی راہِ فضیلت پر پہلا قدم رکھتا ہے۔یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انسان چونکہ اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز ہے اس لیے کوتاہ نظری اسے زیب نہیں دیتی۔اسے اپنی نگاہ کو محض چند گز کے فاصلے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ستاروں سے آگے دیگر جہانوں کا سراغ بھی لگاتا ہے۔اس لیے اسے چند آوازیں سننے، چند ذائقے چکھنے اور ایک محدود دنیا تک مقید رہنے کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا۔اس نے اللہ تعالیٰ کی کائنات میں پھیلنا اور غور وفکر کرنا ہے اس لیے انسان کو محض ظاہری حسیات کے ذریعے حاصل ہونے والے علم تک محدود نہیں رہنا چاہیے اسے شہادتوں اور علماء سے استفادۂ علم کی عظیم سہولت کے علاوہ یہ صلاحیت بھی عطا ہوئی ہے کہ وہ کارخانۂ قدرت میں فکر کرے۔آپ کو ایک دفعہ پھر پہلے کہے گئے ان جملوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سماعت وبصارت کی صلاحیت کے علاوہ دل بھی عطا کیا ہے اور دل علم و بصیرت، غور وفکر، اور جذبوں کا مرکز ہے۔دماغ اور اس کے سب کام اسی کے تابع ہیں۔اسی سے عقل گھٹتی اور بڑھتی ہے۔اس عقل کا ایک وظیفہ یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد پر انسان نے اپنی حسیات کی شدت اور اس کے دائرہ کار کو بڑھانا شروع کر دیا اور آخر اس نے ان حسیات کے دائرۂ عمل کو اس قدر وسعت دی کہ تمام چرند پرند اور دیگر مخلوقات انگشت بدنداں رہ گئیں۔گویا وہ پرندے بھی اب انسان کو حیرت سے دیکھتے ہیں، جو سینکڑوں میل کے فاصلے سے طوفان کا سراغ پا کر اپنے آشیانے اٹھا لیا کرتے تھے۔دور سے شکار کی بو سونگھ لینے والی مچھلیاں-- فضا کی بلندیوں سے سطحِ زمین پر موجود شکار کو دیکھنے والی چیلیں سب انسان کی اس ترقی اور تسخیر پر حیران ہیں۔

دیگر مخلوقات جو خود کو انسان سے فطری حسیات کے اعتبار سے بہت آگے سمجھتی تھیں وہ آج اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔اور وجہ ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی ایسی صلاحیت عطا کی ہے جس کی مدد سے اس کی ظاہری حسیات میں دو تین گنا نہیں بلکہ ہزاروں گنا اضافہ ہو گیا ہے۔وہ پہلے ایک محدود فاصلے تک دیکھ سکتا تھا مگر اب دنیا کا کوئی خطہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔دریا ہوں یا سمندر، صحرا ہوں یا پہاڑ اس کی نگاہوں سے کوئی اوجھل نہیں بلکہ یہ تو فضا کی بسیط

وسعتوں اور سمندر کی عمیق گہرائیوں تک میں جھانکنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی حس سماعت کو چند گز کے دائرے میں استعمال کر سکتا تھا تو اب وہ کائنات کی وسعتوں میں نشر ہونے والی سرگوشیاں اور آہٹیں سن سکتا ہے۔ یہ سب اس نے اپنی عقل کی بنیاد پر کر دکھایا ہے جو خلاقِ عالم نے سب انسانوں کو بلا امتیاز عطا کر رکھی ہے۔ البتہ مواقع استعمال اور استعمال کے فرق کی وجہ سے نتائج مختلف ہو رہے ہیں۔

زبان کے بارے میں یہ بات آپ کی یادداشت کی بالائی سطح ہی پر ہوگی کہ بچے زبان اپنے والدین سے بالخصوص ماں سے سیکھتے ہیں۔ اس لیے مادری زبان اس زبان کو کہتے ہیں جو کوئی انسان سب سے پہلے سیکھتا ہے اور یہ سیکھنا والدین کے الفاظ کو دہرانے سے شروع ہوتا ہے۔ بلکہ آپ کے علم میں ہوگا کہ آٹھ دس ماہ کی عمر میں جب بچہ اپنے ذخیرۂ الفاظ کی ایک غیر شعوری کوشش کے مرحلے پر ہوتا ہے تو وہ والدین (یا گھر کے کسی دوسرے فرد سے بھی جو جوائنٹ فیملی کی صورت میں گھر میں موجود اور بچے کے ساتھ کافی منسلک ہو) سے ایک لفظ سیکھ کر اسے ایک دو دن تک مسلسل دہراتا رہتا ہے۔ یہ بھی اس کے سیکھنے کا ایک انداز ہے۔ اور اس طرح دہراتے دہراتے بتدریج اس کا ذخیرۂ الفاظ بڑھتا جاتا ہے۔ مگر سیکھنے کے حوالے سے انسان دوسرے حیوانات سے اس لیے مختلف ہے کہ انسان صرف اندھی تقلید نہیں کرتا بلکہ اس عمل میں اپنی سوچ کو شامل کر کے اختراع اور ایجاد بھی کرتا ہے۔ یعنی انسان صرف سنتا نہیں بلکہ سننے کے بعد اس پر غور بھی کرتا ہے اور اس غور کے نتیجے میں سنی گئی معلومات میں اپنے تجربے کے نتیجے میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ چاہے سننے والا فرد کوئی چھوٹا سا بچہ ہی کیوں نہ ہو، وہ تخلیق و تحقیق کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔

آپ نے اکثر اپنے بچوں یا بہن بھائیوں کو آغاز تکلم کے اس مرحلے پر دیکھا ہوگا، کہ اچانک ان کی زبان سے کوئی ایسا لفظ یا جملہ نکل سکتا ہے جو آپ کو حیران کر دے گا کہ بچے نے یہ جملہ کیسے کہہ دیا۔ ایسی بات تو ہم نے کبھی کہی ہی نہیں۔ حضرت حسّان بن ثابت بڑے معروف صحابی ہیں۔ ان کی چھوٹی سی بچی جو ابھی کھیلنے کی عمر میں گلی میں کھیلنے کے لیے گئی اور تھوڑی دیر بعد روتی ہوئی واپس آ گئی۔ حضرت حسان کہتے ہیں کہ بیٹے کیا ہوا؟ بچی بولی کہ اسے ایک کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ جب حضرت حسان نے پوچھا کہ کس کیڑے نے کاٹا ہے؟ بچی کو اس کیڑے کا نام نہیں معلوم تھا۔ اسے دراصل ایسی بھڑ نے کاٹ لیا تھا جو دو رنگ کی ہوتی ہے یعنی سرخ اور سیاہ۔ اس کے جسم پر دو رنگوں کی پٹیاں ہوتی ہیں۔ بچی کے ذہن میں فوراً ایک صورتِ بیان آئی اور اس نے کہا کہ اسے ایک ایسے کیڑے نے کاٹا ہے جس نے یمنی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یمنی چادر ایک خاص زینت رکھتی ہے۔ اس کا ڈیزائن سادہ ہوتا ہے جس میں سرخ، سیاہ زرد پٹیاں متوازی لگی ہوتی ہیں۔ اور یہی ڈیزائن بار بار دہرایا جاتا ہے۔ جب بچی نے یہ جملہ کہا تو حضرت حسان جیسے حساس آدمی تڑپ اٹھے اور انہوں نے بے ساختہ کہا

واللہ قُلتِ شعراً (اللہ کی قسم تم نے تو شعر کہہ دیا۔)

یعنی بچی نے ایسا خوبصورت جملہ کہہ دیا کہ جس میں شعور پایا جاتا ہے۔ [یہ بھی مطلب نکل سکتا ہے کہ جس میں شعریت پائی جاتی ہے لیکن موقع کی مطابقت سے پہلا مفہوم زیادہ صحیح ہے]۔ ایسے تجربے انسان اپنے بچوں کے حوالے سے اپنی زندگی میں دیکھتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل اور شعور کی قوت عطا کر رکھی ہے اس کے نتیجے میں انسان صرف علمی مواد کو وصول ہی نہیں کرتا بلکہ اس پر غور کر کے اسے اپنے اعمال میں راسخ کرتا ہے اور آگے بڑھاتا ہے۔ اس

میں نکھار اور ندرت پیدا کرتا ہے۔ نئی نئی چیزیں داخل کر کے اس میں اضافہ کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان کی زبان کچھ عرصے کے بعد بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔

آپ نے غور کیا ہوگا۔ دنیا بھر کے تمام جانور ازل سے اپنی نوع کے لیے عالمی سطح پر فطری طور پر مقرر بولی ہی بول رہے ہیں۔ اس میں کوئی ترقی یا تغیر نہیں ہوا۔ آپ دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں ٹوکیو سے لے کر بیونس آئرس تک اور اٹلانٹا سے لے کر آسٹریلیا تک آپ کسی بھی ایک قسم کے جانور کو دیکھیں گے کہ وہ ان تمام خطوں میں ایک ہی زبان بول سکتا ہے۔ یہاں کے کوے، طوطے اور شیر، دنیا بھر کے کووں، طوطوں اور شیروں کی طرح سے اظہار مدعا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ابتدائی صلاحیتیں تو عطا کر رکھی ہیں مگر ان میں اضافہ کرنے کی صلاحیت صرف انسان کو دی ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو اپنی صلاحیت کو بڑھاتا بھی ہے اور اس میں اصلاح بھی کرتا رہتا ہے۔ اس انداز میں کہ کچھ چیزیں اس کی زندگی سے نکلنا شروع ہو جاتی ہیں اور کچھ نئی آنے لگتی ہیں (جب پرانے نظریات، تجربات کے نتیجے میں غلط ثابت ہوتے ہیں تو ان کی جگہ نئے نظریات لے لیتے ہیں۔) اسی طرح انسان اپنے معاملات کو آگے بڑھاتا ہے اس لیے کہ عقل اسے نئے امکانات کے بارے میں غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کے بعد انسان عقل ہی کے ایک اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے جسے تخیل کہتے ہیں۔ ظاہر ہے تخیل کو عقل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک عظیم الشان قوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کر کے اسے دیگر بے شمار مخلوقات سے ممتاز کر دیا ہے۔ عام انسان عقل کے ابتدائی مرحلے میں ہی پوری زندگی بسر کر دیتے ہیں اور اس کے اگلے مدارج طے کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا اس کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کچھ لوگ دوسرے اور تیسرے درجے تک بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جو عقل کی منزل پر ایک قدم اور بڑھا کر تصورات کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں تاہم ایسی صورت میں زیادہ تر عوام ایسے منفرد افراد کے تخیلات کا مذاق اڑاتے اور انہیں مجنون و مفتون سمجھنے لگتے ہیں لیکن جب ان کے تخیلات کے ثمرات عملی زندگی میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں، تو ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے، آپ نے اور ہم سے پہلے کے لوگوں نے بچپن میں بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔

ایک کہانی کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں۔ جو بہت عام ہے کہ ایک فرد (تصور کی دنیا کا کوئی شہزادہ) سفر پر کوئی خاص مقصد لے کر نکلتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ فلاں فلاں شرائط پوری کرے گا تو کامیاب ہو جائے گا۔ سفر کرتے کرتے اچانک اس کے راستے میں سمندر یا پہاڑ حائل ہو جاتا ہے یا صحرا اس کی منزل کو مشکل بنا کر اسے پریشان کر دیتا ہے اور جب اس کی ناکامیوں کا تسلسل اسے مایوسی کی حد تک پہنچانے والا ہوتا ہے تو اچانک ایک سفید ریش بزرگ ظاہر ہو کر اس کی مشکل کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور آخر اپنے تھیلے سے ایک جادو کا قالین نکال کر اسے دیتا ہے کہ اس قالین پر بیٹھو اور سمندروں، پہاڑوں اور صحراؤں کی رکاوٹوں سے بالا بالا اپنا سفر جاری رکھو! فضا میں سفر کے عنوان پر بے شمار کہانیاں لکھی گئیں جو میں نے اور آپ نے پڑھیں، مگر اب یہ محض کہانی نہیں ہے۔ کیا فضاؤں اور خلاؤں میں سفر اب بھی

محض ایک تخیل ہے۔نہیں۔اب یہ ایک حقیقت ہے۔اس سفید ریش بزرگ نے جو جادوئی قالین عطا کیا تھا جس پر ایک یا دو افراد بیٹھ کر سفر کر سکتے تھے اب اک خواب نہیں بلکہ دیو پیکر طیاروں اور خلائی سیاروں کی صورت میں فضا تو کیا خلاؤں میں محوِ پرواز نظر آتے ہیں۔اس تمام ترقی کے پیچھے فضاؤں کو تسخیر کرنے کا تخیل موجود ہے جو انسان کی اس خواہش کا مظہر ہے کہ اس کے راستے میں سمندر، صحرا اور پہاڑ حائل نہ ہو سکیں۔اور جب انسان نے اس تصور کی روشنی میں باقاعدہ سوچ بچار کا آغاز کیا تو بالآخر اس کامیابی تک (بتدریج) پہنچ کر دم لیا۔گویا اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔اس سے ملتی جلتی ایک اور داستان بھی آپ کے مشاہدے اور مطالعے سے گزری ہوگی کہ ایران کا بادشاہ جمشید ایک ایسا پیالہ رکھتا تھا (جو جامِ جمشید یا جام جم کے نام سے ادب میں محفوظ ہے) جس میں وہ جب چاہتا اپنی مملکت بلکہ دنیا بھر کے کسی بھی حصے کے حالات دیکھ سکتا تھا۔یعنی وہ عوام کی سوچ اور فکر سے لے کر اپنی اور دشمن کی فوجوں کی کارروائیاں تک اس میں دیکھ لیتا تھا۔جب وہ چاہتا ایک مخصوص کمرے میں جا کر اپنے پیالے کے ذریعے دنیا کے تازہ ترین حالات وواقعات سے آگاہ ہو جایا کرتا تھا۔اس پر غالب کو کہنا پڑا کہ:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

مگر یہ ترقی، تخیل انسانی کا ایک اور کرشمہ ہے کہ گمنام صدیوں میں جو جام صرف جمشید ایرانی کی کہانی میں موجود تھا اب اس سے کہیں بہتر شکل میں عام سے عام آدمی کے گھر میں بھی موجود ہے۔بلکہ کٹیاؤں میں بھی یہ ٹی وی دیکھا جا سکتا ہے جس میں دنیا بھر کے حالات آپ اپنے گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔یہ انسانی تخیل کی داستان ہے جس میں انسان کی ابتدائی سوچ سے لے کر اختراع وایجادات تک کا سفر شامل ہے۔انگریزی کی ایک مصنفہ شارلٹ برونٹے کے شہرۂ آفاق ناول ''جین آئر'' کی ہیروئن مصیبت میں سینکڑوں میل دور رہنے والے اپنے ہمدرد کو آواز دیتی ہے تو وہ اس کی آواز کو سن لیتا ہے اور بالآخر سفر کی مشکلات جھیلتا اور رکاوٹوں کو عبور کرتا اس تک پہنچ جاتا ہے۔اور اس سے پوچھتا ہے کہ فلاں دن مغرب سے پہلے کیا تم نے مجھے آواز دی تھی؟ تو اسے جواب ملا کہ ہاں میں نے تمہیں پکارا تھا۔

یہ محض ایک کہانی تھی مگر یہ صرف کہانی نہیں رہی بلکہ حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ تخیل اور وجدان نے انسان کو کس قدر طاقت بخشی ہے، یہ حواس کی قوت کو پرواز عطا کر دیتی ہے۔اور دیکھیے اس کے بعد ایک اور ذریعہ حصولِ علم، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو دیا ہے جو بہت کم تعداد میں انسان تک پہنچتا ہے۔یہ وجدان اور لاشعور کی قوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور خاص ارادے سے انسان تک پہنچتی ہے۔یہ سلسلہ اچانک انسان پر ادراک اور عرفان کے دروازے کھول دیتا ہے۔مثلاً آپ یقیناً جانتے ہیں کہ درختوں سے پھلوں کا گرنا ازل سے جاری ہے لیکن یہ ادراک کسی شخص کو کسی خاص وقت اور مقام پر مشیتِ ایزدی سے عطا ہوا کہ یہ جو پھل درخت سے کٹ کر نیچے گرا ہے یہ اوپر یا دائیں بائیں کیوں نہیں چلا گیا۔اس تخیل کے پیدا ہوتے ہی نیوٹن تجربات کی دنیا میں داخل ہوا اور نتیجے کے طور پر

طبیعیات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر کے تحقیق و جستجو کے نجانے کیسے کیسے نئے دروازے کھول دیے۔ اس سب ترقی کی بنیاد اس کی یہ ابتدائی دریافت تھی کہ زمین کی کشش ثقل ہر شے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اور اسی ابتدائی دریافت ہی نے انسان کو زمین کی کشش ثقل سے نکل کر ستاروں کی دنیا میں پہنچنے کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ عطا کیا ہے اور آج وہ چاند پر اپنا انتہائی قدم رکھ کر خلا کی بسیط وسعتوں میں چھلانگ لگا چکا ہے اور ابھی اس کی آئندہ پرواز کی وسعتیں غیب سے برآمد ہونے کو ہیں تاہم یہ خیال رہے کہ سوچ، فکر اور اختراع و ایجاد کی قوتیں بھی انسان کو اللہ رب العزت ہی نے عطا کی ہیں۔ یہ سب باتیں میں اپنی جانب سے نہیں کر رہا بلکہ علماء، فلاسفہ اور اہل فکر کی باتیں ہیں جو ہم ایک دوسرے کی یادداشت کی تازگی کے لیے بیان کر رہے ہیں۔

آپ کبھی بھی تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر کیجیے، تو آپ جان پائیں گے کہ مختلف افراد کو حاصل ان قوتوں کی مقدار و معیار میں بہت تفاوت ہوگا مگر بنیادی صلاحیت فکر سب میں یکساں ہوگی جو تمام انسانوں میں مشترک ہے۔ یہ جو گفتگو میں آپ کے سامنے کر رہا ہوں یہ صرف آج تک محدود نہیں ہے بلکہ صدیوں سے ان موضوعات پر انسان اظہار خیال کرتا آ رہا ہے۔ میں یہاں چند منتخب اور منفرد افراد کا ذکر کروں گا جنھوں نے علم کی وضاحت اپنے اپنے انداز میں کی ہے، جس سے مقصدِ علم اور اس کے ذرائع کی کچھ نشاندہی ہوتی ہے۔

☆ افلاطون کے بقول ''علم ایک انسانی ذہنی کیفیت ہے جو شعور و آگہی کے اعلیٰ ترین مرحلے پر انسان کو حاصل ہوتی ہے''۔ اسی موضوع پر ہم ابھی گفتگو کر رہے تھے کہ انسان اپنے مشاہدے، مطالعے اور تبادلۂ خیال سے جو معلومات حاصل کرتا ہے وہ آگے چل کر اس کے شعور اور آگہی کی حدود متعین کرتی ہیں۔

☆ کلارک کے خیال میں علم حقائق اور اصولوں پر مشتمل ایسا مجموعہ ہے جو انسان نے وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج ترتیب دیا ہو، آپ کو یاد ہوگا کہ اس گفتگو کے بالکل آغاز میں عرض کیا گیا تھا کہ علم انسانی زندگی کو ترتیب دینے کا نام ہے۔ یہی خیالات کلارک کے بھی ہیں جس کے مطابق انسان اپنی معلومات کو جمع کرتا ہے تاکہ اپنی زندگی اور اس کے لوازمات و وظائف کو مرتب کر سکے۔

☆ ڈیوڈ بلوم کہتا ہے کہ ''علم تصورات کا ایسا سانچہ ہے جس کی روشنی میں انسان اپنے تئیں حاصل کردہ معلومات کو خاص (قابل فہم) شکل دیتا ہے اور اس طرح وہ اپنے معاملاتِ فکر و نظر کو آگے بڑھاتا ہے''۔

مختلف ماہرین کے نقطۂ نظر سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علم انسان کا حاصل کردہ ایسا معلوماتی ذخیرہ ہے جسے بیان کے بعد کسی ذریعے سے محفوظ کر لیا گیا ہوتا کہ آنے والے زمانوں میں دوسرے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی زندگی میں کچھ تجربات کرتے ہیں۔ اپنی حسیات کے ذریعے ان سے نتائج اخذ کرتے اور آنے والوں کے لیے راہنما اصول چھوڑ جاتے ہیں۔ یعنی آنے والوں کے لیے نئی راہوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس طرح مزید تحقیق سے نئے نئے میدان کھلتے اور انسانی علم کی ترقی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ اس طرح علم کا

سلسلہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شعبہ تعلیم و تحقیق پر نظر ڈالیے تو آپ دیکھیں گے کہ علم، حقیقت میں اقدار اور معلومات کا ایسا مجموعہ ہے جسے انسان نے اجتماعی طور پر اپنے مطالعے اور وجدان سے ترتیب دیا ہو۔ مطالعہ صرف کتاب یا کتب کی ورق گردانی تک محدود نہیں۔ انسان اس مادی دنیا میں آنے کے بعد پہلے لمحے ہی سے اس کا مطالعہ و مشاہدہ شروع کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مرحلے پر اس کے مطالعے کا دائرہ اس کی ماں کی آغوش تک محدود ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ وسعت پذیر ہو کر آس پاس کے ماحول تک پھیل جاتا ہے اور بڑھتی عمر کے ساتھ کائنات کی وسعتیں بھی انسانی مطالعے و مشاہدے کی حدود میں آجاتی ہیں۔ انسان اس طرح خود انسانوں کا مطالعہ کرنے کے علاوہ حیوانات و نباتات و جمادات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ یوں تو انسان کے آس پاس تحریروں کا ایک لامتناھی خزانہ ہے مگر کبھی کبھی مخصوص انسانوں کو قدرت یہ صلاحیت عطا کرتی ہے کہ وہ ان تحریروں کے بین السطور پیغام کو پڑھ لیتے ہیں۔ اس کو اس طرح بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ جب ہم علم کے حصول کے مختلف ذرائع پر نظر ڈالتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ ان معلومات کے استنباط کے حوالے سے کئی مکاتب فکر وجود میں آ گئے۔

آئیڈیلزم کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ حواس سے حاصل ہونے والا علم غیر یقینی اور غیر معتبر ہے۔ اسی تسلسل میں جب دو چار قسم کی باتیں میں آپ کے سامنے رکھوں گا تو خود بخود مختلف آراء آپ کے سامنے آنا شروع ہو جائیں گی۔ مگر ان آراء کو جب زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے ساتھ دیکھیں گے تو آپ کو کبھی ایک رائے صحیح لگے گی تو کبھی دوسری۔ ایک زاویۂ نظر سے رائے میں کسی نہ کسی خامی یا نقص کی نشان دہی ہوگی مگر دوسرے زاویے سے وہ مکمل نظر آئے گی۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ حواس کے ذریعے جو معلومات جمع کی جاتی ہیں ان میں خامی یا نقص کا وجود قطعی قرینِ امکان رہتا ہے۔ ہمارا اس دنیا کا مشاہدہ یہی ثابت کرتا ہے کہ آج ایک بات سچ لگتی ہے مگر کل کوئی نئی دریافت اس نظریے کو باطل قرار دے دیتی ہے۔ اکثر آپ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک معروف دوا کسی مرض کے شافی علاج کے طور پر معروف ہوتی ہے مگر پھر ایک روز ہم دیکھتے ہیں کہ اسے مضر قرار دے کر میڈیکل سٹورز سے اٹھالیا جاتا ہے اور اس کی کوئی متبادل دوا بازار میں بکتی نظر آتی ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پچھلی دوا میں اگرچہ فائدہ تھا لیکن نقصان زیادہ تھا۔ چنانچہ انسان جیسے جیسے تجربات کی راہ پر آگے بڑھتا ہے اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی آنا قدرتی بات ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنی حسیات کے ذریعے جو علم حاصل کرتا ہے وہ مکمل اور Perfect نہیں ہوتا۔ یقیناً اس علم میں غیر یقینی کی ایک کیفیت موجود رہتی ہے۔

اس ضمن میں کچھ اور مثالیں بھی قابل غور ہیں مثلاً آپ ایک انگلی گرم پانی میں ڈبوئیں اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ٹھنڈے پانی میں۔ پھر یہ دونوں انگلیاں ایک ایسے برتن میں ڈالیں جن میں نیم گرم پانی ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ پہلے ہاتھ کی انگلی کو پانی ٹھنڈا جبکہ دوسرے ہاتھ کی انگلی کو وہی پانی شدید گرم لگے گا۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ حسیات پر پوری طرح بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ بصری مغالطہ یا Illusion کی ایک مثال صحرا میں پانی کے وجود کا احساس ہونا ہے۔ یہ تمام پہلو اسی امر کی دلیل ہیں کہ مادی حسیات دھوکہ دے سکتی ہیں لیکن ان سے مسلسل فائدہ اٹھاتے رہنا فطرت کا تقاضا بھی ہے

اور انسان کی ضرورت بھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو بے حد اہمیت کا حامل ہے، اور وہ یہ، کہ کیا حواس کے ذریعے حاصل ہونے والی ساری کی ساری معلومات نا قابل بھروسہ ہوتی ہیں؟ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر ایسے سارے مشاہدے نا قابل اعتبار ٹھیریں تو زندگی کا سفر ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ بلکہ ایسی صورت میں سائنسی میدان میں ترقی ہی ممکن نہیں ہو پائے گی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ساری انسانی ترقی کی بنیاد میں مادی حسیات کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی حقیقت کی تصدیق کے لیے انسان بار بار اپنے تجربات اور مشاہدات کو دہراتا ہے۔ اور جب ہر بار ایک ہی نتیجہ برآمد ہو تب جا کر اسے سائنسی قانون کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ گویا مادی حسیات کے نتیجے میں حاصل ہونے والا علم معتبر بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی درجۂ اعتبار سے گر بھی جاتا ہے۔

انسانوں کا ایک ایسا گروہ بھی آیا جس نے حقیقت پسندی (Realism) کا نعرہ لگایا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ مادی دنیا میں موجود تمام اشیاء کی تلاش و جستجو، ان کے ایک دوسرے پر اثرات اور اشیا کے حقیقی خواص کی دریافت ہی ان کا مشن ہے۔ لہٰذا ان تمام معلومات کا ذریعہ ہم حواس کو قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ حصولِ علم کا مفید وسیلہ ہیں۔ مثلاً لباس درختوں کے پتوں سے شروع ہو کر جانوروں کی کھال، پھر اس کے بال اور پھر حریر و ریشم و کمخواب تک جا پہنچا۔ یہ سب حواس کے مؤثر استعمال کا شاہکار ہے جس نے انسان کے لباس کو بہتر سے بہتر بنایا۔ فطرت کے مظاہر سے انسان کے سیکھنے کا عمل جاری رہا۔ اس نے گھاس پھوس کھانے کے عہد میں بھی فطری تعلم کا یہ سلسلہ جاری رکھا مثلاً جو شے پسند نہیں آئی یا جس کا ذائقہ اچھا نہیں لگا تھوک دیا۔ جس کے باعث جسم پر تکلیف دہ اثرات مرتب ہوئے اسے ترک کر دیا (پہلے یہ رویہ انفرادی رہا لیکن جیسے جیسے معاشرہ تہذیب کی راہ پر چلا ایک کے تجربات دوسروں تک بھی منتقل ہونے لگے)۔ اسی طرح جن اشیاء کا ذائقہ خوشگوار تھا یا جن سے جسم کو توانائی میسر آئی اسے قبول کر لیا۔ اسی طرح غاروں اور درختوں کی چھاؤں میں رہتے رہتے عالی شان محلّات میں عیش کرنے لگا، اس طرح زندگی کے سب میدانوں میں ان میں پانچ ظاہری حواس کی کارکردگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے ایک اور گروہ سامنے آیا جسے فطریت پسند یا Naturalism پر یقین رکھنے والا کہا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کو پیدائش کے ساتھ ہی فطری صلاحیتوں سے نواز دیا جاتا ہے، پھر وہ اس کائنات میں رہتے ہوئے ہر شئے سے اپنی صلاحیتوں کو نکھارتا اور بڑھاتا رہتا ہے، گویا فطرت Nature ہی انسان کا اصل معلّم ہے، اس مکتب فکر کا ایک معتبر قائد روسو ہے۔

روسو کی فطرت پسندی اور اس سے متعلق دلائل کو لوگوں نے پسند کیا مگر ظاہر ہے جہاں اس نظریے میں کچھ خوبیاں ہیں وہیں کچھ قابل ذکر کمزوریاں بھی ہیں۔ دراصل انسان کی قوتِ مشاہدہ کے استعمال کے دوران دو پہلو روبہ عمل رہتے ہیں جو کہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک آدمی اپنے مشاہدے کے ذریعے کسی شے یا اصول میں سے کچھ خوبیاں ڈھونڈ کر لا رہا ہوتا ہے۔ قطعی ممکن ہے کہ کوئی دوسرا اسی میں کوئی کمی یا خامی محسوس کر رہا ہو۔

ایسے میں فطرت پسندوں نے کہا کہ بہت سے مظاہر فطرت انہیں سلیقۂ زیست عطا کرتے ہیں۔ مثلاً چیونٹیاں انسان کو نظم وضبط سکھاتی ہیں۔ مگر ایک قباحت یہ بھی ہے کہ یہی چیونٹیاں انسان کو ذخیرہ اندوزی بھی سکھا سکتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو شیر دلیری اور بے جگری سکھاتا ہے مگر اس کی ذات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جب سیر ہو چکا ہو تو سست ترین اور دنیا جہاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور دن رات کا بیشتر حصّہ سو کر گزار دیتا ہے۔ جب کہ انسان کی جدید زندگی سے یہ رویہ لگا نہیں کھاتا۔ شیر کی ہیبت اگرچہ پورے جنگل پر طاری رہتی ہے مگر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ جب شکار کر کے سیر ہو جائے اور سو رہا ہو تو اس کے اوپر سے چوہے گزرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی فرد کتے سے وفاداری سیکھتا ہے تو دوسرا اس میں نجاست دیکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دوسرے کے بالکل برعکس نقطہ ہائے نظر ہمیشہ سے دنیا میں موجو ہیں۔ گویا فطرت پر غور و فکر سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے لیکن ہمیشہ سچ اور صحیح نہیں سیکھتا، کبھی غلط بھی سیکھ لیتا ہے جس کی بہت سے مثالیں فکر و عمل کی دنیا میں ملتی ہیں۔

اسی طرح جب عملیت پسند آئے اور نہوں نے کہا کہ علم دراصل غور و فکر اور مشورے کے بعد معاملات سے عملی طور پر نمٹنے سے حاصل ہوتا ہے [دنیا بہترین کتاب ہے اور زمانہ بہترین استاد]۔ گویا عملی تگ و دود کے بعد حاصل ہونے والا مسئلے کا حل علم کی ایک manifestation ہے۔ اس فلسفے پر مزید تحقیق و جستجو کے نتیجے میں اس کی بعض کمزوریوں کی نشان دہی بھی ہوئی۔ مگر ایسے لوگوں نے کسی دوسرے امکان کا راستہ کھلا نہیں رکھا۔ بس اسی پر بضد رہے کہ حواس کے ذریعے حاصل معلومات، زندگی کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ہاں البتہ اس ضمن میں کوئی دقّت پیش آئے تو عملی جدوجہد کے ذریعے اس خلاء کو پُر کیا جا سکتا ہے۔ یہ فلسفہ کافی عرصہ تک بعض دقتوں، مشکلات اور کمزوریوں کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد میں مقبول رہا۔

اس کے بعد ایک گروہ اصولیت پسندی کے فلسفے کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کا خارجی دنیا کے ساتھ تعامل (interaction) کے نتیجے میں حاصل ہونے والا علم حقیقی ہے۔ اس ضمن میں مشاہدہ، عقل اور استدلال وغیرہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ایک حد تک درست ہیں اور ان سے معلومات کے حصول اور ان کی تصدیق میں قباحت نہیں ہے۔ مشاہدہ، عقل اور استدلال وغیرہ کو انسان کے فکری ارتقا میں معاون ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور گروہ آیا جسے اس وقت بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی اور آج تک بھی وہ معروف ہے۔ یہ ترقی پسند گروہ تھا۔ ان لوگوں نے بھی تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہونے والے علم کو معتبر کہا۔ اس اعتبار سے ان کا فلسفہ حقیقت کے بہت قریب ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ انسانی ترقی کی بنیاد ہے لہٰذا ان چیزوں کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ مگر اس وقت ان کی علمیت کی حقیقت کھل جاتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ الہام، وحی یا آسمانی اشارات کے ذریعے حصولِ علم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حالانکہ دنیا کا کوئی گوشہ اور وقت کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب کسی نہ کسی آفاقی مذہب کا دور دورہ نہ رہا ہو۔ ایسے لوگوں نے صرف سائنسی ترقی کو انسانی بہبود کے لیے کافی جانا اور اسی کے گرد پوری انسانی (انفرادی اور اجتماعی)

زندگی کی تصویر کشی کر دی ۔ [اور نتیجہ یہ نکلا کہ مشینوں کی حکومت نے انسانی مروت کو کچل دیا اور انسان کی اہمیت اور قدر و قیمت ایک مشین جتنی بھی نہ رہ سکی]۔

اس کے بعد نو تعمیریت کے پرستاروں کا گروہ آیا جس نے کہا کہ ہم معاشی نمو کے حوالے سے دنیا میں انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کے ہاں بھی اجتماعیت کو اہمیت حاصل نہ تھی۔ اس لیے یہ معاشی ترقی بھی استحصال کی ایک خوفناک manifestation بن کر رہ گئی۔ اس گروہ نے مادی دنیا کو معتبر قرار دے کر اس پر غور و فکر کرنے پر زور دیا۔ اس طرح وہ مادیت میں یوں کھو گئے کہ روحانی دنیا کے تمام مظاہر ان کی نگاہوں سے یکسر پوشیدہ رہ گئے۔ گویا انہوں نے مادی وسائل ہی کو حصولِ علم کے تمام ذرائع قرار دیا۔ اس گروہ کے لوگوں کا خیال تھا کہ انسان مسلسل مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں اپنے اپنے تاریخی تجربے اور جغرافیائی ماحول کے اعتبار سے ایسی مخصوص اقدار متعین کر لیتا ہے جنہیں کسی آفاقی فلسفے (مذہب) کی تائید حاصل ہو۔ ایسی آفاقی تائید کی حامل اقدار کو نا قابل تبدیل قرار دے دیا جاتا ہے۔ یعنی جو اقدار ہمیں آباء و جداد کی طرف سے ملیں نہ صرف ان کی حفاظت کرنی چاہیے بلکہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ بعض معاشرے جو آباء و اجداد کی طرف سے عطا ہونے والی اقدار کے ساتھ آفاقی تعلیمات کی تائید کی شرط قبول نہیں کرتے وہ بعض خلاف مذہب اقدار کو بھی مذہب جتنا ہی تقدس عطا کر دیتے ہیں۔ اور ان کی پاسداری مذہبی فرائض کی طرح خشوع و خضوع سے کرتے ہیں۔ یہ طبقہ ہر دور میں موجود رہا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی ایسا ہوا اور اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا کہ جب بھی اللہ کے کسی نبی نے لوگوں سے پوچھا کہ ان بے جان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو تو ان کی طرف سے یہی جواب ملا کہ ''اسی کام کو کرتے ہوئے ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے'' اس لیے وہ اپنے آباء و اجداد کی روایات کو ہی اصل اہمیت دیتے رہے، ان کے معاشی، معاشرتی اور روحانی معاملات خاندانی روایات کے مطابق چلتے رہے۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف افراد اور گروہوں نے معتبر علم کی مختلف تعبیریں کی ہیں مگر اس راستے کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی محدود ذہنی صلاحیتوں کی مدد سے جو کچھ ایک مرتبہ سوچ کر اس پر اپنی رائے قائم کر لیتا ہے تو اس کے خلاف قوی سے قوی دلائل سن کر بھی نظر ثانی کرنے پر تیار نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے ذہن یا اس کے فہم کی گرفت میں آیا ہے وہ نہ صرف کافی ہے بلکہ وہ کبھی غلط بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جو کچھ دوسرا سوچ رہا ہے وہ درست نہیں ہے۔ انہیں اپنا طریقہ کار درست اور دوسروں کا غلط لگنے لگتا ہے۔

اس طرح کا رویہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سے تنگ ظرفی اور محدود نظری وجود میں آتی ہے جو انسانی فکر کو آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ کیونکہ آزادئ فکر ترقی کی پہلی منزل ہے اور کوئی صاحب فکر انسان تعصب کی تنگ گلیوں میں گھٹن کا شکار ہو جاتا اور بالآخر ذہنی طور پر مردہ ہو جاتا ہے۔ ایسے باشعور انسانوں کا ذہن اس وسعت کا تقاضہ کرتا ہے جس وسعت سے خالق کائنات نے کائنات کی تخلیق فرمائی ہے۔ آپ ہر گروہ کے فلسفے پر غور کرنے میں

آزاد ہیں۔ ہر گروہ کی بات پر غور کرنے کا جواز ہے۔ اس لیے کہ اس میں انسانی اجتماعی فلاح کے لیے جو پہلو ہمیں نظر آئے اسے اپنانا چاہیے۔ علم، فلسفہ، مذہب اور سیاسی نظریات سے ان کے مفید عناصر کو لے کر ان سے استفادہ کرنا چاہیے کہ دانائی مومن کی گم شدہ شے ہے۔ اسی طرح چاہے ثقافت، بود و باش اور علاج معالجے کے نظریات ہی کیوں نہ ہو، جن میں انسانی فلاح کا کوئی مفید پہلو موجود ہے اسے قبول کر لینا چاہیے چاہے وہ کسی بھی پس منظر سے آیا ہو۔ دنیا میں بیماریوں کے علاج کے لیے مختلف طریقۂ علاج موجود ہیں، جن میں سے کوئی بھی طریقہ علاج کسی بھی وقت کسی خاص مرض میں مفید ہوسکتا ہے لیکن یہ قباحت بھی بڑی شدت سے موجود ہے کہ کسی ایک سسٹم آف میڈیسن کے معالج کے پاس جا کر اسے یہ بتا دیں کہ وہ دوسرے سسٹم آف میڈیسن کے معالج کے زیر علاج رہا ہے تو عموماً آپ کو اس نظام علاج کے خلاف ایک بھرپور لیکچر سننا پڑ جائے گا۔ یہاں تک کہ آپ پریشان ہو جائیں گے کہ کاش میں نے اس کا ذکر نہ کیا ہوتا۔ یہی صورت حال مسلک کے حوالے سے بھی ہے، کیونکہ ہر فرد ایک علمی بحث و تمحیص اور تحقیق و جستجو کے نتیجے میں اپنے مسلک کی تصدیق کرنے کی بجائے بس جو کچھ اس تک پہنچتا ہے اس پر ڈٹ جاتا ہے۔ اسی طرح کی صورت حال علم کے حوالے سے بھی ہے۔

حواس، عقل و شعور، فکر و تخیّل، تجربات و مشاہدات کے ساتھ خالق انسان نے اُس کی رہنمائی کے لیے وحی کا ذریعہ بھی پسند کیا ہے، وحی کے سلسلے کو خاص نگرانی میں آگے بڑھایا گیا۔ لوح محفوظ سے جبریل امین کی وساطت سے انبیاء تک ہدایت پہنچائی گئی، اور انبیاء نے پوری دیانت داری کے ساتھ وہ امانت لوگوں تک پہنچا دی۔

وحی کا سلسلہ خاتم النبیین پر مکمل ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات کو مکمل کرتے ہوئے آخری ایڈیشن کی حفاظت کی خود ذمہ داری اٹھالی۔ اس لیے وحی میں علم و ذریعہ علم کے اعتبار سے کوئی نقص یا خامی نہیں ہے۔ اسے بغیر کسی شک و شبہ کے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی جو بات اللہ کی تھی وہ قابل اعتبار ہے اور جو بات انسانوں نے اپنی طرف سے شامل کی ہے اس پر کلام ہوسکتا ہے۔ البتہ اللہ کی آخری کتاب قرآن کے الفاظ بھی چونکہ محفوظ کر دیے گئے ہیں اس لیے وہ تو شک سے خالی ہیں، البتہ تفسیر و توجیہ میں ردّ و قبول ہوسکتا ہے۔

سارے ذرائع علم اللہ ہی کی عطا ہیں، لیکن شرط واحد یہ ہے کہ حواس کا استعمال علم وحی سے حاصل کردہ شعور کی روشنی میں کیا جائے۔ اس لیے کہ انسان کا کھلا دشمن اس کی ظاہری حسیات کے ہر گوشے میں موجود ہے اور مذکورہ راہنمائی اور روشنی کے بغیر انسان کی گمراہی کا امکان موجود رہتا ہے۔ وہ شعور کے ہر گوشے اور ادراک کے ہر حصے میں موجود ہوتا ہے۔ جو خیال اور سوچ کو کسی بھی لمحے غلط سمت دے سکتا ہے۔ نظریات اور عقائد کی دنیا میں عالم انسانیت کے سامنے بیسیوں مثالیں ہیں کہ جب عقل و خرد کو وحی کی ہدایت اور راہنمائی کے دائرے سے نکلنے دیا گیا تو شیطان نے اسے اچک لیا اور اسے گمراہی کی تاریکی میں پھینکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کا ایک اشارہ یہ ہے کہ ہندوستان میں (ماضی بعید میں) بے شمار دانشور موجود تھے۔ مگر یہ خیال کسی ایک فرد کے ذہن میں آیا کہ انسان چار طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ بھگوان نے انسان کو

چونکہ اپنے جسم کے مختلف حصوں سے تخلیق کیا ہے اس لیے جنہیں بھگوان نے اپنے سر سے بنایا وہ سیاسی و مذہبی سرداری اور قیادت کے مستحق ٹھہرے، جنہیں بازووں سے بنایا وہ قوتِ بازو کے مظاہرے یعنی عسکری ذمہ داری کے قابل قرار دیے گئے۔ جنہیں پیٹ سے بنایا ان کے ذمے کھیتی باڑی کے ذریعے انسانوں کی خوراک کا بندوبست کرنے کی ذمہ داری دی گئی اور جنہیں بھگوان نے اپنے پیروں سے بنایا ان کا کام محض باقی تینوں ذاتوں کے افراد کی خدمت کرنا ہے۔ (انہیں علی الترتیب برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کہتے ہیں)۔ گویا ایک فرد کے ذہن میں یہ خیال آیا اور اس کے نتیجے میں صدیوں تک ایک مخصوص ذات کے لیبل کے ساتھ کروڑوں انسانوں کی قسمت میں اندھیرے لکھ دیے گئے۔ اس لیے وحی کا علم لازم ہے جو انسانی حواس اور صلاحیتوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ اگر یہ سب ذرائع پورے اخلاص اور دانش مندی کے ساتھ اختیار کیے جائیں اور ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

☆☆☆☆☆